کشمیر میں اسلام، تصوّف اور فارسی ادب کا ہمقدم تشریف آوری اور اُن کی مشترکہ ترویج واشاعت سے جنت نظیر کشمیر کا ایران صغیر بن جانا

جہاں کشمیر کی سرسبز اور شاداب سرزمین حُسنِ فطرت کے نظر نواز مناظر کی امین رہی ہے وہاں اس کے حسین اور ذہین باشندگان کی روحانیت پسند موروثی افتادِ طبع عہد قدیم سے ہی علم و عرفان کی طرف اتنی مائل رہی ہے کہ اس کا چپہ چپہ اعلیٰ انسانی اقدار کی آبیاری کرنے والوں نے خیالات کی نزہت اور جذبات کی تہذیب و تطہیر سے ہمکنار کرنے کی کوشش کی ہے۔ ایران کے شاہنامہ فردوسی کی طرح گذشتہ پانچ ہزار سال کی ایک گونہ منظوم تاریخ راج ترنگنی کی صورت میں دستیاب ہوجانے کی بدولت اُس کے مصنف پنڈت کلہن کے مشاہدے میں آئی ہوئی بات کشمیریوں میں اب تک موجود رہے ہوئے صوفیانہ میلانات کے تناظر میں کوئی مبالغہ نہیں لگتی جو اُس نے اپنی اس ضخیم کتاب کے آغاز میں یوں لکھی ہے کہ ''کشمیر میں تل دھرنے کے برابر بھی ایسا کوئی زمان کا ٹکڑا نہ ملے گا جو پاکی اور تقدس کی طرف مائل نہ رہا ہو (ترجمہ آر ایس پنڈت ص: ۱۰)

کشمیر کے فارسی مورخوں میں ممتاز مقام رکھنے والے خواجہ محمد اعظم دیدہ مری ''واقعات

کشمیر'' نام کی اپنی کتاب میں کشمیریوں سے منسوب روحانیت پسندی کی یہی بات یوں بیان کرتے ہیں:

''کشمیر جنت نظیر کارخانہ قدرت کا ایک ایسا شاہکار اور نگارستانِ تقدیر کا ایک ایسا ممتاز نمونہ ہے جو اپنی پاکیزگی، نفاست، امن پروری اور خوشگوار آب و ہوا کے اعتبار سے ہر طبقۂ خیال کے سیاحوں اور ہر سطح کے نکتہ رسوں کے لیے ممتاز کشش رکھتا ہے (واقعاتِ کشمیر ص:۳)

سر فرانس نیگ ہسبنڈ اور جی ٹی وائنی جیسے یورپی جہاں گردوں کی طرف سے کشمیر کو مشرق کا یونان اور ایشیا، کا سیز رلینڈ جیسے اعزازی نام دئے جانے سے بہت پہلے سولہویں صدی کے اعلیٰ ذوقِ جمال اور ادیبون شاعروں کے تئیں مخصوص قدردانی کا مظاہرہ کرنے والے مغل شہزادہ سلیم نے تزکِ جہانگیری نام کی اپنی کتاب میں کشمیر شناسی کا رُخ خارجی مظاہر سے اہالیان کشمیر کے باطن کی طرف موڑ کر ایسا ہی تاثر یوں پیش کیا ہے کہ ''کشمیر ایک سدا بہار باغ بھی ہے اور ایک مضبوط ترین قلعہ بھی۔ یہ بادشاہوں کے لیے ایک عشرت افزا گلشن ہونے کے علاوہ درویشوں کے لیے بھی ایک دلکُشا خلوت کدہ ہے۔ اس خطے کے خوشنما باغ اور دلاویز آبشار شرح و بیان سے زیادہ حسین ہیں۔ اس سرزمین پر میٹھے پانی کے لطیف چشمے اور جاری و ساری نہریں حساب و شمار سے کہیں زیادہ ہیں۔ جہاں تک نظر کام کرتی ہے سبزہ ہی سبزہ دکھائی دیتا ہے۔ یہاں گل سرخ، بنفشہ اور خود رو نرگس جیسے پھول بکثرت دیکھنے میں آتے ہیں۔ دیگر انواع گل اور اقسام ریاحیان اس سے کہیں زیادہ کہ شمار کئے جاسکیں۔ بہار کے موسم میں کشمیر کے کوہ و دشت اقسام شگوفہ سے مالا مال ہوتے ہیں بلکہ مکانوں کے در و دیوار اور صحن و بام بھی لالہ کی مشعلوں سے بزم افروز دکھائی دیتے ہیں..... کشمیر کی تمام عمارتیں لکڑی کی ہیں جو دو منزلہ سہ منزلہ اور چہار منزلہ بنائی جاتی ہیں۔ چھتوں کو خس پوش کر کے پیاز، لالہ اور چوغاشی بودئے جاتے ہیں جو سال بسال

موسمِ بہار میں کھل اٹھتے ہیں اونہایت خوشنما معلوم ہوتے ہیں۔ ذوقِ جمال کا یہ تصرّف کشمیریوں کے ساتھ مخصوص ہے'' (تزکِ جہانگیری ص: ۲۸۵ اور اقبال نامہ جہانگیری: ص: ۱۱۴)

حاضرینِ کرام ان دو تین اقتباسوں کے ذریعے آپ کے حُسن شناس دل اور اذہان آٹھویں صدی ہجری اور چودھویں صدی عیسوی کے سیاق وسباق میں منتقل یا ٹرانسپورٹ کر لینے کے بعد میں مشتے نمونہ از خردارے چند ایسے حقایق کی نشاندہی کروں گا جو کشمیر میں اسلام، تصوف اور فارسی زبان وادب کی ہم قدمی اور پُرخلوص تعاونِ باہمی واشتراک عمل سے اس خطۂ دلپذیر کو اپنے رنگ میں رنگ کر ایرانِ صغیر بناتے ہیں۔ پہلے یہ بات ذہن میں رہے کہ ایران کے باستان شناسوں کی طرح برصغیر کے محقق بھی اس بات کی توثیق کرتے ہیں کہ قدیم مشترکہ آبائی گھر ایرانو تج میں جب یکتا پرست بھائیوں کے ساتھ شکر رنجی بڑھ جانے کے بعد اصناف پرست رجحان والے بھائی اُن سے الگ ہو جانے پر مجبور ہو گئے اور مغرب ومشرق کی طرف مہاجرت اختیار کرنے والے آرین قبیلوں کی طرح چند قبیلے ہندوکش پہاڑ کو پار کر کے پنجاب اور کشمیر میں کول و دراوڑ اور ناگ و پشاچ جیسے مقامی لوگوں پر غالب آ گئے تو بھی انہیں غیر شعوری طور پر ایرانو تج کے آس پاس کا علاقہ یعنی ماوراالنہر اور خراسان خواب میں آتا رہا بمصداق کبھی بھولی ہوئی منزل بھی یاد آتی ہے راہی کو بلکہ اس کے مصداق بھی کہ

گو واں نہیں ہیں واں سے نکالے ہوئے تو ہیں کعبے سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دور

کے اس پس منظر میں کشمیریوں کا ایرانی بھائیوں کے ساتھ ہم رنگ وہم شکل ہونا کوئی مقام تعجب نہیں البتہ یہ ضرور حیرت زا امر لگتا ہے کہ صدیوں کی جدائی کے بعد بھی کشمیریوں میں وہ یکتا پرستانہ رُجحان کیوں کر شیومت من کرنیا جنم لیتا ہے اور عہد قدیم میں جس طرح پہلی صدی سے چھٹی صدی عیسوی تک اعلیٰ پایہ بدھ بھکشوؤں میں شامل ذہین وفہیم کشمیری بلخ و بخارا کے ستم رسیدہ

لوگوں کے زخموں پر مرہم رکھنے والے برمکیوں کی طرح برہما، جاوا، سماٹرا، چین اور جاپان تک اپنی انسان دوستی اور دلنوازی کا پرچم لہراتے ہیں۔ اُس سے کہیں زیادہ موثر ڈھنگ سے چودھویں صدی کے دوران اپنے ورود مسعود سے گذشتہ تین صدیوں کے دوران عیاش راجاؤں کی خرمستیوں اور بدکردایوں سے لُٹے پٹے کشمیریوں کی دلجوئی دین اسلام کے وہ مبلغ اور عالم کرتے ہیں جنہیں حرف عام میں ہم کاروانِ سادات کا گہرا اثر کہہ کر یاد کرتے ہیں۔ چنانچہ جہاں کشمیر نسل بدھ بھکشوؤں نے ستم رسیدہ ترکستانیوں اور ایرانیوں کی دلجوئی بہت پہلے کی تھی وہاں اب نئے آب ورنگ سے کشمیر کی تعمیر نو میں جُٹ جانے والے ماہرینِ اسلام وتصوف وفارسی ادب مبلغین کی طرح کے دوررس اثرات والے اقدام سے کشمیری بھائیوں کے دل جیت لیتے ہیں۔

صرف اشاروں سے کام لینے کی غرض سے میں ایک مختصر سا خاکہ یہاں پر مرتب کروں گا ایک پسِ منظر کے طور پر صرف دو باتیں ذہن میں رکھنے کی ہیں اول یہ کہ تجارتی لین دین کی طرح ثقافتی روابط بھی کبھی یک طرفہ نہیں ہوتے فرق صرف حاکم اور محکوم قوم کے اثر ونفوذ کی کمی وبیشی کا ہوتا ہے۔ اسی طرح یہ بات بھی مسلم ہے کہ تبلیغی مشن صرف اقوال کا سہارا نہیں لیتا بلکہ عمل اور کردار کی مثالیں پیش کر کے بالواسطہ ترغیبات کو زیادہ موثر بناتا ہے۔ یہی کچھ صفِ اول کے مبلغین اسلام نے کیا۔ چنانچہ اندرونی نفرت اور ذات پات کے شکار کشمیریوں کے لیے لنگر خانہ بلبل لنگر یا لنگر خانہ سمنانیہ میں سب ہی مسلمانوں کا ایک ہی صف میں کھڑا ہو کر نماز پڑھنا ایک ہی دسترخوان پر ہم طعامی اختیار کرنا ایک اچنبھا ہی نہ تھا۔ انسانی اقدار کا ایک ناقابلِ یقین عمل نمونہ بھی تھا۔ پھر ایک دوسرے کے دکھ درد کو بانٹنے میں اُن کا ہر قدم پر یہ ثبوت دینا کہ ؎

مسلمان کے لہو میں ہے سلیقہ دلنوازی کا
مروّت حُسنِ عالمگیر ہے مردان غازی کا

اب آپسی چپقلشوں اور تصادم نے کشمیر میں ایک طرف بدھ مت اور ہندومت کے ماننے والوں کو اس مقام پر پہنچا دیا تھا کہ وہ پردار کی کہلانے کی پرواہ کئے بغیر تبت کے رینچن شہہ زادے اور سوات کنہر کے شہمیر کو اپنوں پر ترجیح دینے کی نوبت محسوس کر رہے تھے۔ پھر جب انہوں نے سراپا اخلاص و ہمدردی رکھنے والے مبلغینِ اسلام کے گفتار اور کردار کو بخوبی سمجھا تو دیکھتے ہی دیکھتے کشمیر میں وہ تغیّر رونما ہوگیا جو کشمیر میں سب سے بڑا سماجی، مذہبی اور ثقافتی انقلاب کی صورت میں ظاہر ہوگیا۔ اور یوں نہ صرف نویں اور دسویں صدی عیسوی سے ہی فارسی شعرأ کا محبوب شعری موضوع بنا ہوا کشمیر اب معنوی طور پر اور شعوری طور پر ایرانِ صغیر بن جانے پر آمادہ ہوجاتا ہے بلکہ اُن کے اظہارات پر نئے سرے سے غور کرنے کی دعوت بھی دیتا ہے۔

مثلاً فارسی شاعری کے باوا آدم رودکی کا یہ کہنا کہ ؎

برخیز و بمیخانہ خرام ای بُتِ کشمیر
می خور کہ بہ می میشود اندوہ جوان پیر

یا عمارہ مروزی کا یہ کہنا کہ ؎

بہار خانۂ کشمیر میں بوقتِ بہار
بباغ کردہ ہمہ نقش خویشتن تسلیم

اور عنصری کا یہ اظہار جیسے کشمیر کو نزدیک سے دیکھ کر کہا ہے کہ ؎

یکی را العبت کشمیر خواند　　یکی را بر کشیدہ سروِ کشمیر
بہ نقش این نباشد جزو بہ کشمیر　　بہ سروِ آن نباشد جزو بہ کشمیر

ایران کا قومی شاعر فردوسی جہاں آخری ساسانی تاجدار یزدگرد سوم کو بھاگتے ہوئے

ساتھ اٹھائی گئی چیزوں میں کشمیری شال شامل ہونے کا اشارہ یوں کرتا ہے کہ۔

ازتاج وازتخت ومہر ونگین

ہمان جامۂ روم وکشمیر وچین

وہاں فردوسی کا ہم عصر سلطان محمود غزنوی کا درباری شاعر فرخی کشمیر کے راجہ سنگرام راج سے فاتح محمود کی ناراضگی کا منظر نامہ اس حلفیہ اظہار کی صورت میں پیش کرتا ہے جو محمود نے سر دربار یوں کیا تھا۔

شاہیت بکشمیر اگر ایز دخواہد

امسال نیارامم تاکین نکشم زوی

غزنوی دور کے بعد سلجوقی دور کے بڑے فارسی شاعر بھی کشمیر سرائی کا سلسلہ جاری رکھتے ہیں مثلاً جہاں قطران کہتا ہے۔

ای بخوبی رتبانِ کابل وکشمیر میر

ماندم ازبس کاوری درو بلدہ ہا تاخیر خیر

اسی طرح ملک الشعرا امیر معزی اس مرغوب شعری موضوع کو نئی جہتوں سے نوازتا ہے کبھی یہ کہہ کر کہ۔

بلند قامت ایشان چو سرو در کشمیر

بدیع صورتِ ایشان چو نقش در کشمیر

اور کبھی یوں۔

پیام دادم نزدیکِ آن بتِ کشمیر　　　　که زیر حلقۂ زُلفت دِلم چراست انہر

بہرحال کشمیر کے سرو کی مذہب زرتشتی کے حوالے سے جو اہمیت وہی اہمیت قدیم

خوشگوار روابط مابین ایران و کشمیر کے حوالے سے بُتِ کشمیر ترکیب کو حاصل ہے۔ مزید غور کرنے کی بات ہے شکر ہے کہ مجھے اس کی شروعات کرنے کا موقعہ اپنی پی۔ ایچ۔ ڈی تھیسس میں ۱۹۷۶ء کے دوران مل گیا وہ بھی اس لحاظ سے کہ میرا مذکورہ تحقیقی مقالہ عظیم فرزند کشمیر شاعر مشرق علامہ اقبال کی اُس دردمندانہ اپیل اور خواہش کو تکمیل پذیر کرانے کی ایک رِندانہ بلکہ عقید تمندانہ جسارت تھی جسِ کو شاعر کشمیر پیرزادہ غلام احمد مہجور اور مورخ محمد دین فوق جیسے باصلاحیت لوگ بھی انجام نہ دے سکے تھے۔ علامہ اقبال نے ۱۲ مارچ ۱۹۲۲ء کے روز اِس اپیل اور خواہش پر مبنی جو خط نہایت دردمندی سے تحریر کیا ہے میں نے اُسی کو اپنی تھیسس کے ماتھے کا جھومر بنایا ہے جو اُس کے دوسرے صفحے پر پورا درج ہے یہاں صرف اِس کے چند جملے دیکھئے۔

''مکرم بندہ..... اسلام علیکم

مجھے یہ معلوم کر کے کمالِ مسرّت ہوتی ہے کہ آپ تذکرۂ شعرای کشمیر لکھنے والے ہیں میں کئی سالوں سے اس کے لکھنے کی تحریک کر رہا ہوں۔ مگر افسوس کسی نے اِدھر توجہ نہ کی۔ آپ کے اِرادوں میں اللہ تعالیٰ برکت دے۔

افسوس ہے کشمیر کا لٹریچر تباہ ہو گیا۔ اس تباہی کا باعث زیادہ تر سکھوں کی حکومت اور موجودہ (یعنی اُس وقت کی ڈوگرہ) حکومت کی لاپرواہی اور نیز مسلمانان کشمیر کی غفلت ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ وادی کشمیر کے تعلیم یافتہ مسلمان اب بھی (بچے ہوئے) موجود لٹریچر کی تلاش و تحفظ کے لیے ایک سوسایٹی بنائیں''

وہ جو کہتے ہیں ۔ ای بس آرزو کہ خاک شدہ

حضرت علامہ کی اتنی شدید تاکید اور ذاتی وابستگی جتلانے کے باوجود اُن کے صاحب صلاحیت عقید تمند ''من دیوانہ'' کے نام قرعہ فال پڑنے تک اس محسنانہ خواہش کی تکمیل کے لیے

کوئی ٹھوس کوشش نہ کر سکے تھے۔ چنانچہ مہجور صاحب کی چند اوراق پریشان بھی میرے کسی کام نہ آ سکے لیکن اللہ کا نہایت فضل و کرم ہوا کہ میں ۱۳۳۹ء۔۱۵۵۵ء تک فارسی تصنیفات و تالیفات کے ساتھ کشمیر میں سرگرمِ عمل رہتے ہوئے تقریباً دوسو شاعروں اور عالموں کے علاوہ انکی تقریباً تین سو کتابوں اور رسائل کا تنقیدی جائزہ پیش کر سکا۔ یہ مقالہ اِسکی اشاعت پر مامور میرے عزیز شاگرد ڈاکٹر محمد امین قادری (مرحوم) کی جوانمرگی کے بعد کیوں نہ چھپ سکا۔ اُسکی وجہ قہر درویش برجان درویش کے سِوا کچھ نہ تھی۔ شکر ہے کہ میں نے اصل مخطوطہ یعنی تحقیقی مقالے کا مسودہ بھی ساتھ لایا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ شعبہ فارسی کے اس بین الاقوامی سیمینار کی کارکردگیوں سے متعلق چھپنے والے رسالے میں وہ انتساب درج رکھنے کی خواہش بھی کی جائے اس لیے میں اُس کے الفاظ یہاں پر بھی درج رکھتا ہوں یوں:

انتساب

خطۂ کشمیر میں روحانی، ثقافتی، سیاسی اور اقتصادی تعمیرِ نو کا سنگِ بنیاد رکھنے والے اُس عظیم بانی تمدن اور عہد آفرین معمارِ قوم کے نام جن کی عظمت اور کشمیر نوازی کو فرزندِ کشمیر علامہ اقبال نے اس طرح اپنے گلہائے عقیدے پیش کئے ہیں۔

سید السعادات سالارِ عجم — دست او معمارِ تقدیرِ اُمم

خطہ را آن شاہ دریا آستین — داد علم و صنعت و تہذیب و دین

آفرین آن مرد، ایرانِ صغیر

با ہنرہای غریب و دلپذیر

نوٹ: ''ایران صغیر'' ترکیب اپنے دامن میں ایک دریای معانی رکھتی ہے اس کا ایک مختصر تعارف مقالہ کے صفحہ ۴۰ اور ۴۱ پڑھکر سنایا جاسکتا ہے۔

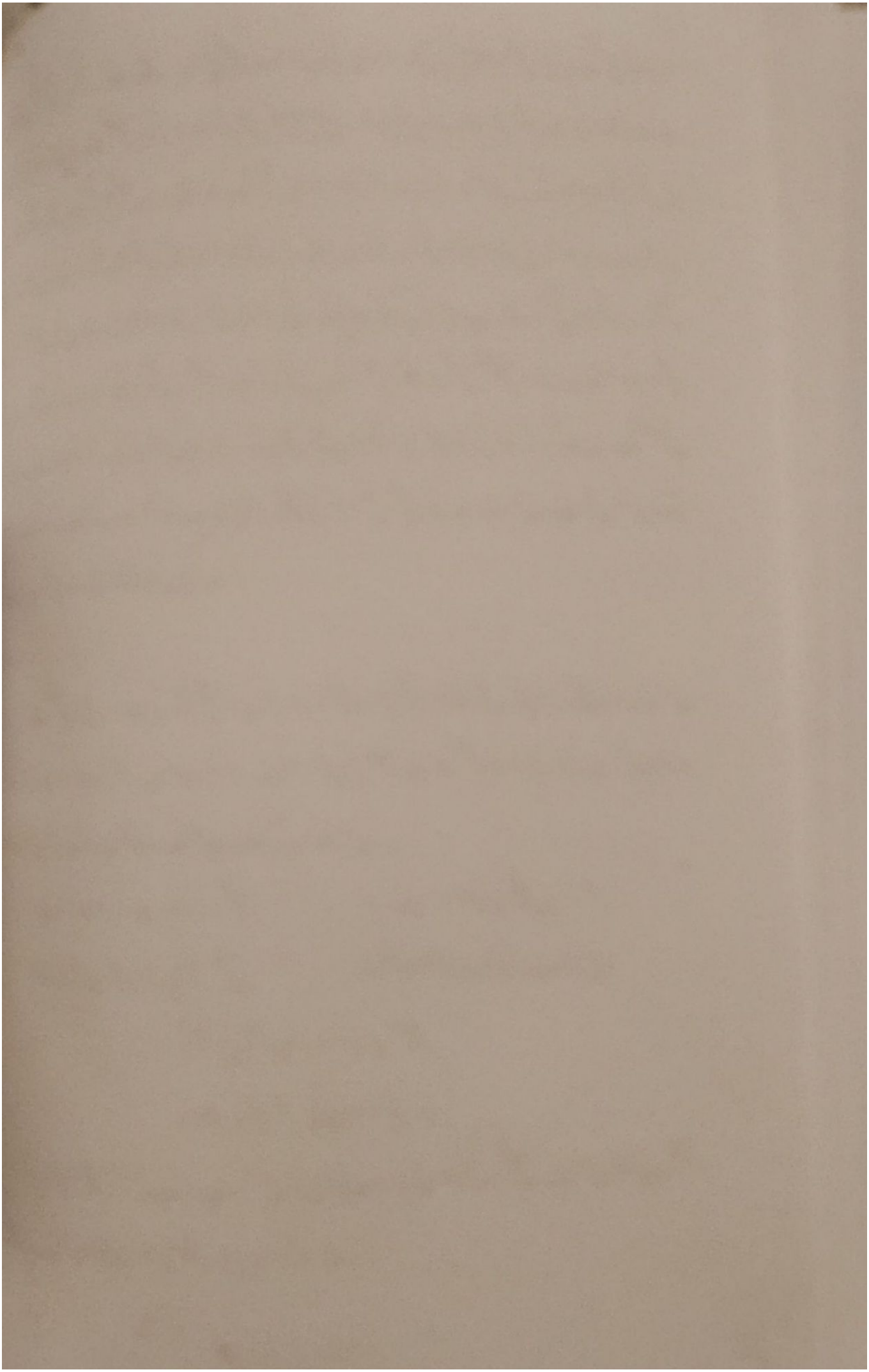

حجت الاسلام حضرت محسن میری
اتاق ایران را افتتاح می فرمایند۔

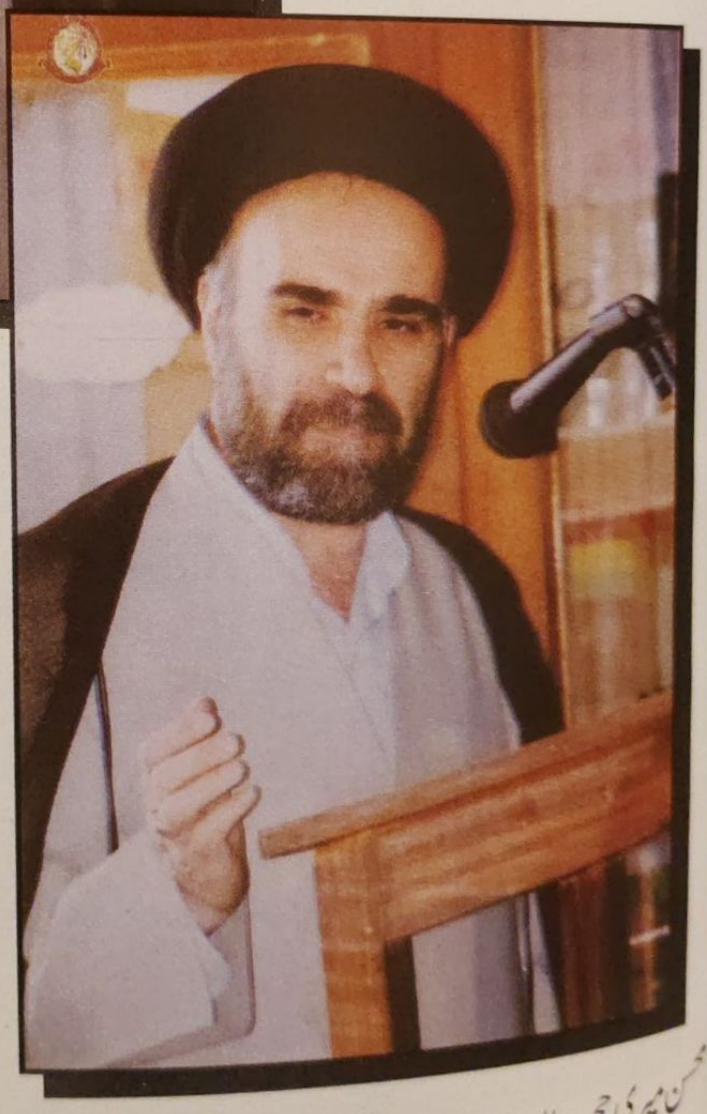

محسن میری حجت الاسلام (رایزن محترم ونماینده، صدر جمهوری اسلامی ایران وجیران افتتاحیه، اتاق ایران
خطاب می فرمایند۔

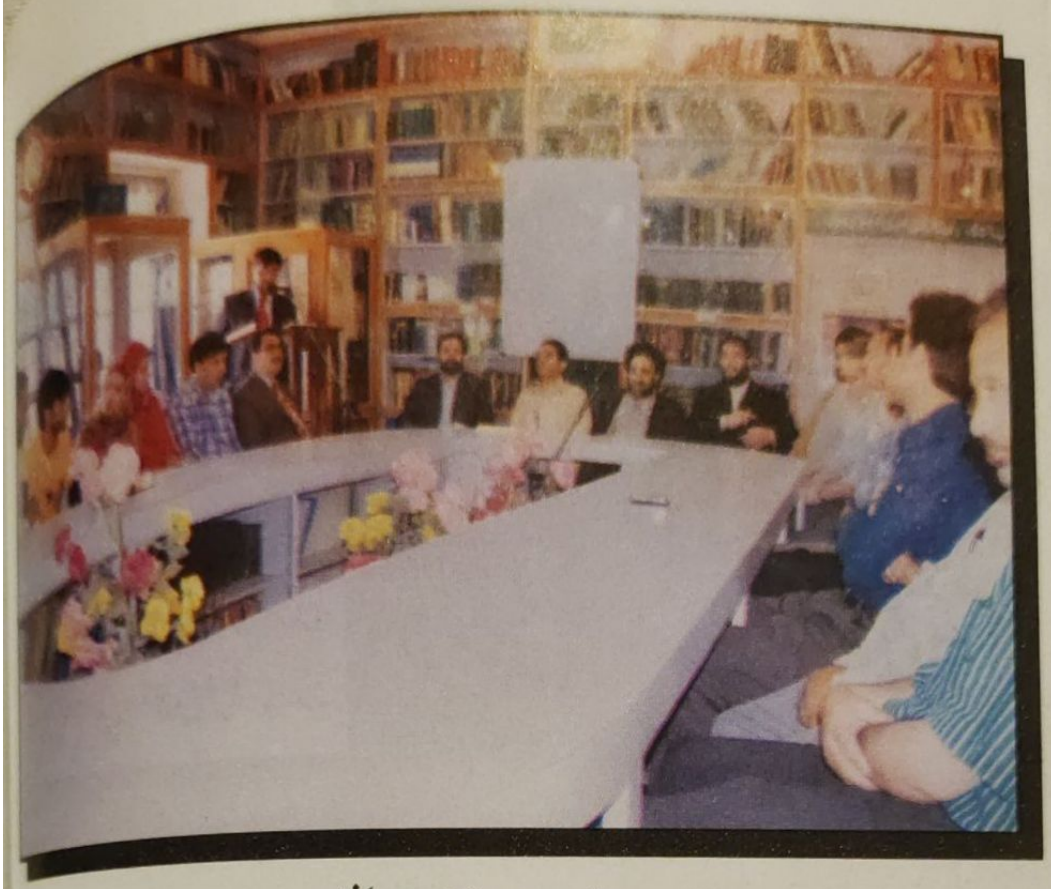

افتتاحیہ اتاق ایران در کتابخانہ بخش فارسی۔

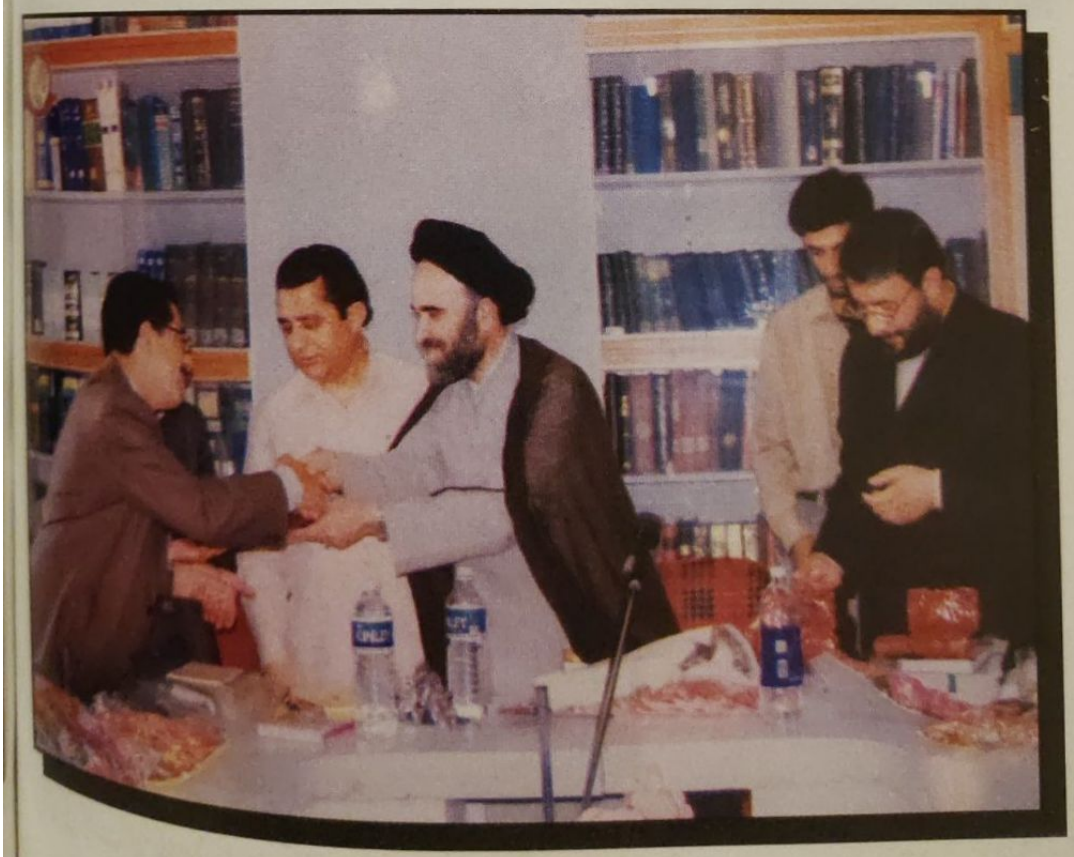

ریاست محترم مضافحہ بہ حجت الاسلام جناب محسن میری در تعظیم ہدیہ گذاری۔

سابقه رئیس دانشگاه کشمیر پروفیسور (دکتر) عبدالواحد همراه رایزن محترم خانه فرهنگ آقای جلال تمله
درجلسه افتتاحیه سمینار ورود اسلام وگسترش فرهنگ زبان وادبیات فارسی در کشمیر۔

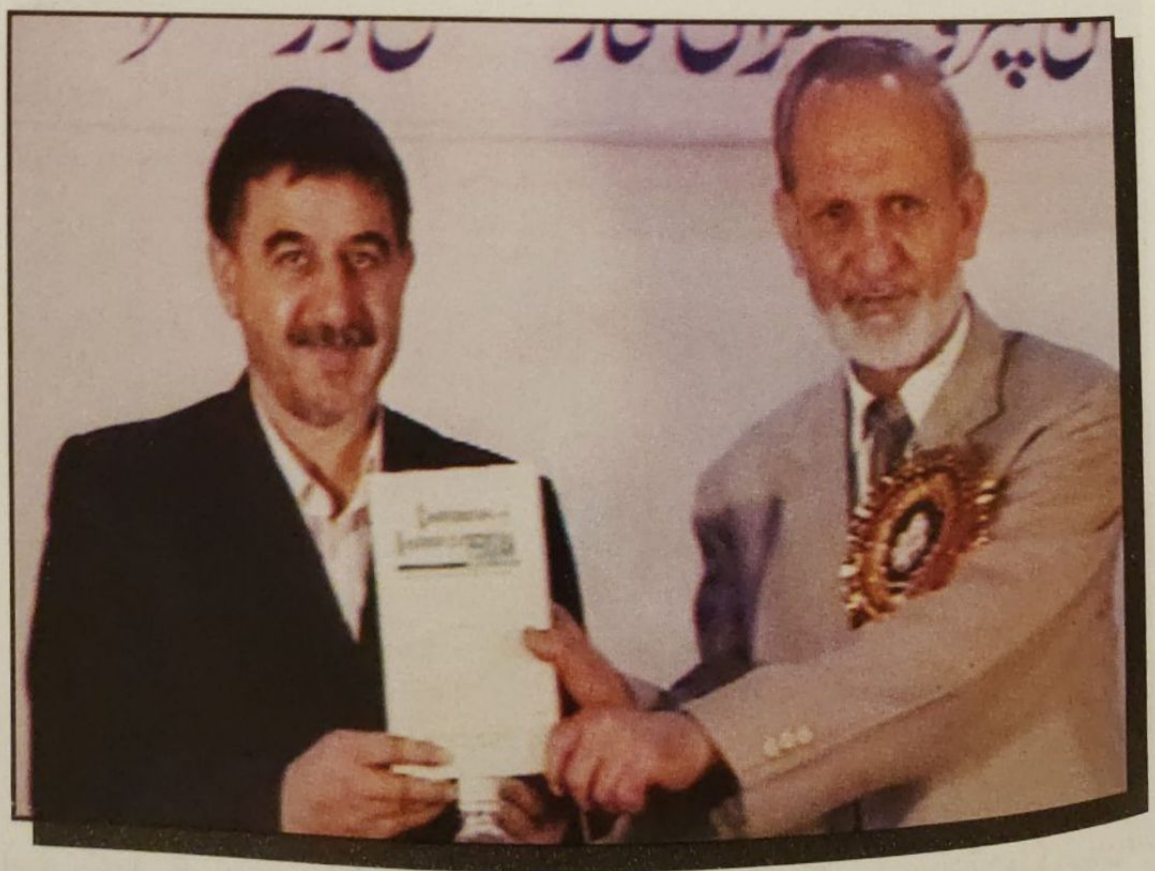

اجرای چاپهای بخش فارسی۔

استاد دکتر ابراهیمی در کتاب بخانه فارسی نسخه خطی۔

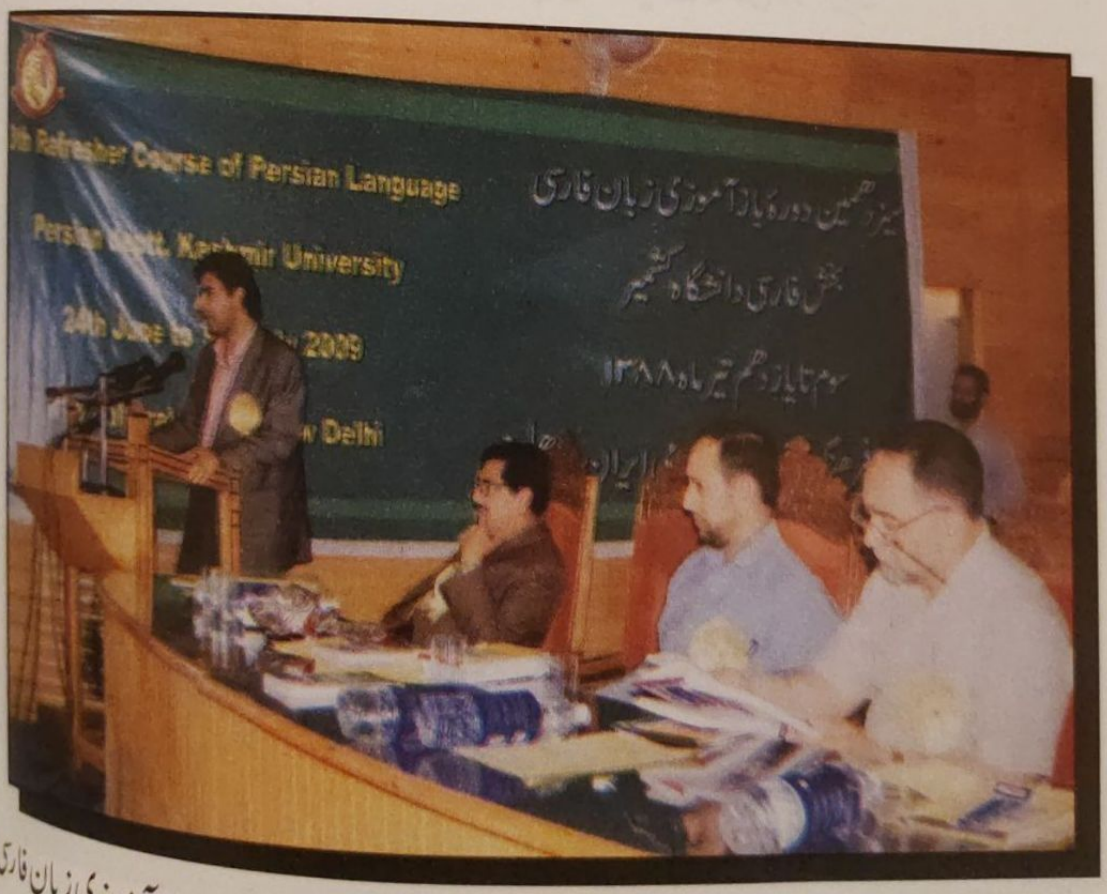

رایزان خانه فرهنگ ایران دهلی نو جناب دکتر عبدالحمید ضیای در جلسه افتتاحیه دور باز آموزی زبان فارسی بخش فارسی دانشگاه کشمیر۔